بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

البناء العظیم

(۲)

اب اجازت دیجئے کہ میں اپنا نقطۂ نظر ذرا کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کروں۔!

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کو۔ وہ رشتہ میں میرے ماموں زاد بھائی تھے۔ لیکن ساتھ ہی رفیق کار اور بڑے گہرے دوست۔ بھی تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے میں نے ان کو بہت قریب سے جس طرح دیکھا ہے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ اور اس بنا پر ان کے غیر معمولی اوصاف و کمالات۔ نہایت بلند کیرکٹر اعلیٰ اخلاق و عادات کے باعث جو عزت و وقعت ان کی میرے دل میں تھی اور ہے وہ کم لوگوں کے دل میں ہوگی۔ مسلمان ان کو مجاہد ملت کہتے تھے۔ لیکن میری رائے میں یہ خطاب ان کے مرتبہ سے گراہوا تھا۔ وہ درحقیقت انسانیت کے مجاہد تھے۔ نہ کہ کسی ایک خاص فرقہ یا گروہ کے۔ بہرحال اس قرب تعلق اور سیاسی مسلک میں ہم خیالی اور ہم آہنگی کے باوصف تقسیم کے بعد مجھ کو ان سے دو باتوں میں بنیادی اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ ایک یہ کہ ان کو کانگرس اور خصوصاً پنڈت جی اور مولانا ابوالکلام آزاد پر بڑا بھروسہ تھا اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ کانگرس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا کہ آپ کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑنا چاہیئے۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ پارلیمنٹ کے آزاد ممبر ہوتے تو ان کی آواز میں زیادہ وزن ہوتا اور اس طرح وہ مسلمانوں کی خدمت زیادہ موثر طریقہ پر انجام دے سکتے تھے۔

مولانا مرحوم کا جو کام تھا انتہائی خلوص اور بے لوثی کے ساتھ تھا۔ جہاں تک کہ مجھے معلوم ہے الیکشن کے موقع پر وہ کانگریس کے ایک پیسہ کے بھی روادار نہیں تھے۔ سارا خرچ خود اٹھاتے تھے۔ وہ ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ کانگریس کیسی ہی کچھ ہو بہرحال ملک کی پارٹیوں میں سب سے زیادہ بااقتدار۔ بااثر اور افکار و خیالات اور عمل و کردار کے لحاظ سے بھی سب سے بہتر ہے پھر مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں جو لوگ تھے کم و بیش وہ سب مولانا کے رفیق کار اور بے تکلف ساتھی تھے۔ اسی لئے اس وقت جب کہ مسلمانوں کے سر پر قیامت گزر رہی تھی اور ضرورت تھی کہ ان کے گھڑی گھڑی کے حالات و واقعات حکومت تک پہونچائے جائیں اور ان کے حل کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ مولانا کے لئے کانگریس سے وابستہ رہنے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ مرحوم نے مسلمانوں کے معاملات پر گفتگو کرتے وقت پنڈت نہرو جیسے شخص کو بعض اوقات اس بری طرح لتاڑا ہے کہ پنڈت جی بلبلا کر رہ گئے ہیں۔ مگر یہ ان کی شرافت تھی کہ مولانا کے وہاں سے چلے آنے کے بعد اس قسم کے موقعوں پر انھوں نے ہمیشہ مولانا کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ۔ میرا سچا دوست اور خیر خواہ تو حفظ الرحمٰن ہے جو علانیہ میرے منھ پر میری کمزوریاں اور میری حکومت کی کوتاہیاں بیان کرتا اور ان پر مجھے متنبہ کرتا ہے۔ [1]

بہرحال یہ مصالح تھے۔ جن کے باعث مولانا کانگریس سے الگ ہونا پسند کرتے تھے اور نہ پارلیمنٹ کی سیٹ چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ مصالح میں محسوس کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میری رائے یہی تھی۔

---

[1] چنانچہ حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کے بیان کے مطابق جو اس وقت وہاں موجود تھے اس سلسلے کا سب سے زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ جب مولانا جبل پور سے واپس آکر پنڈت جی سے ان کے مکان پر ملے ہیں تو حال یہ تھا کہ مولانا جبل پور میں مسلمانوں کی تباہ کاری کے اپنے عینی مشاہدات بیان کرتے جاتے اور روتے جاتے تھے یہاں تک کہ پنڈت جی بھی رونے لگے۔ اور اس کے بعد جب مولانا جبل پور میں حکومت اور پولیس کے مظالم پر آئے تو اب ان کی ملامت اور غیظ و غضب کا نشانہ خود پنڈت جی بن گئے۔ اس پر پنڈت جی نے اس وقت مولانا کو کچھ جواب بھی دیئے۔ لیکن بعد میں مولانا کی تعریف کی۔

کہ جس شخص پر مسلمانوں کی قیادت کا بارِ گراں ہو اس کو ملک کی کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہونا چاہیئے۔ تاکہ پارلیمنٹ میں وہ کسی پارٹی ڈسپلن کا پابند نہ ہو۔ اس ایک اختلاف کے علاوہ دوسرا بنیادی اختلاف یہ تھا کہ مولانا ایک طرف اپنے آپ کو اور اپنی جماعت یعنی جمعیۃ علماء کو دیکھتے تھے اور دوسری طرف پنڈت جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھتے تھے۔ اس کے برخلاف میں یہ چاہتا تھا کہ مولانا مسلمانوں کو دیکھیں جن کے ووٹوں سے ملک تقسیم ہوا ہے اور دوسری جانب اکثریت کو دیکھیں جو اس وقت سخت مشتعل اور برسرِ کین ہے۔ اس وقت جبکہ مسلمانوں کے سر پر قیامت گذر رہی تھی میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم مقدم اور ضروری امر یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کا موریل (MORALE) قائم رکھا جائے۔ کیونکہ جب کسی قوم کا موریل بگڑ جاتا ہے تو پھر وہ مصافِ ہستی میں ناکارہ ونامراد ہو کر رہ جاتی ہے اور دنیا میں کسی تعمیری کام کے قابل نہیں رہتی۔ اور اس کی مثال اس بدقسمت فوج کی سی ہوتی ہے جس کے دل پر غنیم کے عظیم الشان لشکر۔ سازوسامان طاقت و قوت۔ اور کثرتِ تعداد وغیرہ کی ہیبت بیٹھ گئی ہو اور وہ میدانِ جنگ سے بے تحاشا بھاگ کھڑی ہوئی ہو۔ نفسیات کی زبان یوں سمجھیے کہ جو شخص اور جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے اس سے صحیح معنی میں زندگی اور توانائی کی سب صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں

چنانچہ قرآن مجید میں یہ آیات ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون

اور الا ان حزب اللہ ھم — جی ہلکا نہ کرو اور غمگین نہ ہو تم سب سے بلند ہو۔

المفلحون — خبردار! بیشک اللہ والے ہی فلاح یاب ہونگے۔

اور اسی قبیل کی اور بہت سی آیات کا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان کسی موقع پر بھی احساس کمتری کا صید زبوں نہ ہوں۔ اور کسی قوم کا موریل قائم رکھنے کے لئے میرے نزدیک صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ قوم بڑی بہادر ہے۔ اس کی تاریخ چنین وچناں ہے۔ اور اس کا مذہب ایسا اور ویسا ہے بلکہ قوم کو یہ بات بھی باور کرانی ضروری ہے کہ وہ جس ماحول میں رہ رہی ہے

وہ سرتاسر تاریک نہیں ہے۔ مستقبل میں ان تاریکیوں کے ختم ہونے اور روشنی کے نکل آنے کا یقین ہے۔ اور جن لوگوں میں یہ قوم رہ رہی ہے ان میں برائیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہیں۔ کیونکہ آخر وہ انسان ہیں اور انسان میں خیر و شر دونوں کی صلاحیتیں ودیعت رکھی گئی ہیں۔ فرض کیجئے ایک لڑکا ہے جو نہایت محنتی اور ذہین اور قابل ہونے کے باوجود امتحان میں فیل ہو گیا ہے تو اب اگر آپ یہ کہنا شروع کر دیں کہ جتنے ممتحنین ہیں سب بیحد متعصب اور فرومایہ ہیں۔ اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار بھی متعصب اور بے ایمان ہیں اور ان سے کبھی انصاف کی توقع ہو ہی نہیں سکتی تو سوچیے ان باتوں کا لڑکے کے مورل پر کیا اثر ہو گا؟ کیا اپنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود اسے پھر دوبارہ امتحان میں بیٹھنے کا حوصلہ ہو گا؟ ہرگز نہیں!!

اس بنا پر میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم سے کہتا رہتا تھا کہ آپ لوگوں کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کا مورل نہ بگڑے اور مورل بگڑنے سے ایک قوم میں جو عادات قبیحہ پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً چڑچڑاپن ناکامی اور مایوسی کا شدید احساس۔ بیکسی اور کس مپرسی کا اذعان شکست خوردگی کا یقین تعمیری جد و جہد سے بددلی اور بے رغبتی اور فراریت کا جذبہ۔ وہ پیدا نہ ہونے پائیں۔ یعنی ملک کی تصویر کا صرف ایک رخ جو بھیانک ہے نہ دکھایئے۔ لیکن دوسرا رخ جو نسبتہً بہتر اور خوش گوار ہے وہ بھی دکھایئے۔ اور فسادات کی خبریں اس طرح مت چھاپیئے جن کو پڑھ پڑھ کر دنیا یہ سمجھے کہ ہندوستان کے مسلمان انتہائی بے بس اور کمزور ہیں بلکہ وہ مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ اور بڑی آسانی سے مولی اور گاجر کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ اور خود مسلمان بھی ہندوؤں سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر رہ جائیں۔

بہرحال دو بنیادی نقطہائے نظر کے باعث جن میں مجھ کو مولانا سے اختلاف تھا میں نے ایک مرتبہ ۱۹۵۸ء میں ان سے کہا کہ اب اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ گاؤکشی کو قانوناً بند

کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو چونکہ مسلمان اس کی مقاومت نہیں کر سکیں گے اس لئے وہ جبر محسوس کریں گے اور اس سے ان کی خودی مجروح ہوگی۔ اس بنا پر قانون بننے سے پہلے ہی آپ مسلمانوں کی طرف سے اعلان کر دیجئے کہ ہم خود گاؤکشی ترک کرتے ہیں" لیکن مولانا یہ سن کر آگ بگولا ہوگئے اور فرمایا! تقسیم سے پہلے اگر ہم ایسا کرتے تو اس کی کوئی وقعت ہو بھی سکتی تھی۔ اب ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ سب کہیں گے کہ ہم دب کر اور ذلیل ہو کر ایسا کر رہے ہیں" مولانا عمر میں مجھ سے سات برس بڑے اور بھائی تھے۔ اس لئے حد درجہ محبت کرنے کے ساتھ کبھی بگڑتے تو بری طرح بگڑتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی بگڑے اور یہاں تک کہہ گئے کہ اگر گاؤکشی قانوناً بند ہوتی ہے تو اچھا ہے دنیا یہ تماشا تو دیکھے گی کہ سکولرزم اور جمہوریت کے مدعی کس درجہ عالی حوصلہ لوگ ہیں اس پر اور کیا کہتا بس یہ کہہ کر چپ ہو گیا بھائی یہ باتیں لڑنے کی نہیں حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور ان کو سدھارنے کی ہیں۔

علاوہ ازیں دوسرا اختلاف اردو زبان سے متعلق تھا میری رائے یہ تھی اگرچہ اردو کے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی ہے اس کی اصل وجہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق اور ان کی طرف اس کی نسبت ہے۔ تاہم زبان کسی ایک مذہبی فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ہندوستان کی ایک مشترکہ میراث ہے۔ اس بنا پر جمعیتہ علمائے ہند کو اردو تحریک کی تائید تو کرنی چاہیئے لیکن اس کی قیادت سے بچنا چاہیئے۔ مولانا کو میری اس رائے سے بھی اختلاف تھا۔ چنانچہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان کی شخصیت جمعیت علمائے ہند میں جس درجہ اہم اور قائدانہ تھی اتنی ہی انجمن ترقی اردو میں تھی۔ مولانا کو اس کا شدید ملال تھا کہ اگرچہ اردو زبان کے ہندو ادیبوں شاعروں اور اہل قلم کی ایک خاص تعداد ہے جو اردو تحریک میں کھل کر مسلمانوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ لیکن پھر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے اس تحریک کی حمایت جس قوت اور بھروسہ کے ساتھ ہونی چاہیئے

بھی وہ نہیں ہو رہی ہے اور وہ اس معاملہ میں خود اپنی قوم کے فرقہ پرستوں سے مرعوب ہو گئے ہیں چنانچہ جب میں کلکتہ میں تھا اور آزادی کے بعد پہلے جنرل الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مولانا کلکتہ آئے یہاں ایک روز ایک مجلس میں چند مسلمان نوجوانوں نے میری موجودگی میں سوال کیا کہ اگر ہم لوگ کانگریس چھوڑ کر کمیونسٹ پارٹی میں چلے جائیں تو مولانا کو اس پر اعتراض تو نہیں ہوگا؛ مولانا نے فوراً جواب دیا۔ ہرگز نہیں! آپ بڑے شوق سے جائیں۔ لیکن بس ایک بات یاد رکھیئے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ حالات سے سخت بددل اور مایوس ہو کہ آپ جس چیز کی توقع اور تلاش میں کمیونسٹ پارٹی میں جا رہے ہیں وہ چیز آپ کو وہاں بھی نہیں ملے گی۔ پھر فرمایا پارلیمنٹ میں کمیونسٹ پارٹی کے افراد سے میرے ذاتی تعلقات اچھے ہیں اور میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن مجھ کو اس بات کا بڑا ملال ہے کہ پارلیمنٹ میں جب اردو کا معاملہ آیا تو پہلے سے مجھ سے وعدہ کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے بھی میری تائید نہیں کی اور اس میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ فرقہ پرستی کی جو باد سموم اس وقت ہمارے ملک میں چل رہی ہے اس سے کم و بیش وہ تمام افراد متاثر ہیں جن کے نام ہندوؤں کے سے ہیں۔ خواہ سیاسی مسلک کے اعتبار سے وہ کسی بھی پارٹی کے ممبر ہوں۔

بہرحال مجھ میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ میں جو کچھ سوچتا تھا اپنی لائبریری یا ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر اس لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتا تھا اور مولانا کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ایک میدان میں کھڑے تھے جہاں آسمان کا رنگ کچھ اور ہی نظر آتا تھا جہاں فضا سخت مکدر اور غبار آلود تھی۔ گرم ہوائیں بڑی شدت سے چل رہی تھیں۔ اور بگولے رقص کر رہے تھے۔ ان سب چیزوں نے ان کو آتش زیر پا اور سراسیمہ کر دیا تھا۔ وہ ان سب کے خلاف لڑ رہے اور ان سے جنگ کر رہے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ ان چیزوں کا اثر ان کے مزاج اور طبیعت پر بھی غیر معمولی ہوا تھا وہ نہایت جری اور حوصلہ مند

انسان تھے۔ با ایں ہمہ آخری دنوں میں ان میں جھنجھلاہٹ۔ اور زود رنجی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ بات بات پر خفا ہوتے اور بگڑنے لگے تھے اگرچہ پھر جلد ہی نرم پڑ جاتے اور مسکرا دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں پر ان چیزوں کا جو اثر ہوا وہ بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا اور بد قسمتی سے ان میں وہ تمام بیماریاں پیدا ہوگئیں جو احساس کمتری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ :-

که دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قومیں محض ہائے ہائے کرنے۔ اظہار مظلومیت۔ گریہ وزاری۔ اور شکوہ شکایت سے بنتی نہیں بلکہ بگڑتی اور کمزور ہوتی ہیں

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(۲) اس سلسلہ میں دوسری چیز جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ اسی نمبر ایک پر متفرع ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ چونکہ جمعیۃ علماء مسلمانوں کے لیڈر اور ان کے اخبارات و رسائل سب کے سب فسادات کے تسلسل اور ان کی شدت کے باعث انہیں احتجاجی اور حفاظتی اسباب و وسائل میں الجھ کر رہ گئے اور ایک منصوبہ بنا کر ان تعمیری کاموں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے جن سے بحیثیت ایک فرقہ کے قوت اور توانائی پیدا ہوتی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے فسادات کی اصل وجہ یہ ہے کہ ملک کا سماج فاسد ہے اور چونکہ مسلمان ضعیف کمزور اور غیر منظم ہیں۔ اس بنا پر سماج کے اس فساد کا نشانہ مسلمان ہی بنتے ہیں پس اگر مسلمان اپنی تعمیر میں جد و جہد اور کوششوں کے ذریعہ سے اس ضعف اور بیچارگی کو دور کرلیں تو بے شبہ اس سے فسادات کی روک تھام میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے :-